OPEN ACCESS

Kashf Journal of Multidisciplinary Research
Vol: 02 - Issue 08 (2025)
P-ISSN: 3007-1992 E-ISSN: 3007-200X
https://kjmr.com.pk

اردو افسانہ ”آخری آدمی“ کا ردِ تشکیلی مطالعہ

A Deconstructive Study of Urdu Short Story "The Last Man"

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Article Info

This article is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license https://creativecommons.org/licenses/by/4.0

Abstract

Intezar Hussain is one of the most prominent short story writers in the history of Urdu literature. He is famous for his unique style of story writing. "The Last Man" is one of his most popular short stories. This short story is a poignant exploration of human resilience and existential contemplation. Set against the backdrop of a post-apocalyptic world, the narrative delves into the psyche of the sole survivor, grappling with the profound loneliness and the burden of being the last remnant of humanity. This article is based on the deconstructive study of the Urdu short story "The Last Man".

Keywords:

Intezar Hussain, Deconstructive Study, The Last Man, Urdu Short Story.

انتظار حسین اردو ادب کے ممتاز افسانہ نگار، ناول نویس، اور کالم نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں میں قدیم روایات، ہجرت کا دکھ، ماضی کی یادیں اور تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں ماضی کی یادوں کو داستانوی فضا کے ذریعے تازہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ماضی پرستی سے مراد قدیم روایات میں پناہ لینے کی خواہش کا اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں پرانی اقدار کے کھو جانے اور نئی اقدار کے سطحی اور جذباتی ہونے کا دکھ نمایاں نظر آتا ہے۔ انتظار حسین علامتی اور استعاراتی اسلوب کو نت نئے ڈھنگ سے استعمال کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ تاہم اپنی تمام تر ماضی پرستی، مستقبل سے فرار اور انکار کے باوجود ان کی تحریروں میں سوز اور حسن ہے۔ بقول ڈاکٹر اعجاز راہی:

> "انتظار حسین نئی کہانی کاری کا پہلا نام ہے، جس نے علامتی انداز کو شعوری سطح پر برتا اور کہانی کو جہانِ تازہ سے روشناس کرایا۔ انتظار حسین کہانی بناتے ہوئے داستانی زبان، اساطیری، تہذیبی اور مذہبی علامتوں سے کام لیتے ہیں۔"1

"آخری آدمی" ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس کی کہانی کی بنیاد واقعہ سبت پر رکھی گئی ہے۔ کسی سمندر کے کنارے انسانوں کی ایک بستی تھی جس کے لوگ مچھلیاں پکڑ کر گزر بسر کرتے تھے۔ انھیں ہفتے کے روز مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے حرص و ہوس کی تسکین کے لیے اس روز بھی مچھلیاں پکڑنے سے باز نہ آئے، یوں اس گناہ کی پاداش میں انسان سے بندر بن گئے۔ اس نافرمانی کے علاوہ بھی ان میں بہت سی بُری خصلتیں موجود تھیں۔ لالچ، مکر، خوف اور غصے کے باعث وہ اعلیٰ انسانی سطح سے حیوانی سطح پر اتر آئے۔ افسانے کا مرکزی کردار الیاسف ہے جو ان میں سب سے عقل مند ہے۔ وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ بستی کے باقی لوگوں کی طرح آدمیت کے درجے سے گر نہ جائے۔ اس کشمکش میں وہ سخت اذیت سے بھی دوچار ہوتا ہے تاہم انسانی منفی خصائل اسے بار بار اپنی جانب راغب کرتے ہیں۔ مصنف نے یہاں اس نقطہ نظر کو پیش کیا ہے کہ انسان جتنا مرضی ان خصلتوں سے بچنے کی کوشش کر لے لیکن وہ اپنی سرشت کے آگے مجبور ہو جاتا ہے۔ یوں الیاسف بھی اپنی جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو بندر بننے سے نہیں روک سکا۔ گوپی چند نارنگ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "یہاں نفس سے مراد محض نفس نہیں بلکہ جبلتوں کا وہ سارا نظام ہے جو انسان کو مسلسل ایک کشمکش سے دوچار رکھتا ہے اور جب کسی فرد یا معاشرے میں نفس کا عمل دخل حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے تو فرد یا معاشرہ شدید روحانی اور اخلاقی بحران سے دوچار ہوتا ہے۔"2

انسان کی فوقِ انا اور اس کی جبلت کی باہمی کشمکش کہانی میں تجسس کی فضا کو پیدا کرتی ہے۔ سبت کے معنی "کسی کام سے روکنا" کے ہیں۔ افسانے میں اس سے مراد یہ ہے کہ اس قریے کے لوگوں کو مچھلیاں پکڑنے سے روکا گیا۔ مچھلیاں پکڑنے سے بچنا دراصل نئے کلچر سے بچنا ہے جو کہ مذہبی فکر سے غیریت برتتا ہے۔ متن بار بار ماضی کی طرف مراجعت کی ترغیب دیتا ہے۔ بنت الاخضر کا استعارہ ماضی کے ادوار کی طرف لوٹ جانے کا اشارہ ہے۔ اخضر کے معنی سبز کے ہیں، جو کہ خوشحالی کا پیغام ہے۔ ایک ہی استعارے کا بار بار دہرایا جانا ماضی کی تہذیب کی طرف لوٹ جانے کی خواہش کا اظہار ہے۔ اس لیے الیاسف اپنی بے کلی کے اظہار میں اس کو آوازیں دیتا ہے۔

کہانی کی بنیاد چونکہ ایک مذہبی واقعے پر رکھی گئی ہے اس لیے اس واقعے کے مطابق ہفتے کو مچھلیاں پکڑنے والے بندر بن گئے۔ تاہم متن کے مطابق صرف الیعذر مچھلیاں پکڑنے سے بندر بنا۔ باقی جتنے بھی لوگ اپنی جون بدلتے ہیں اُن کی وجوہات مختلف ہیں۔ کوئی ہنسنے کی وجہ سے بندر بنتا ہے، کوئی حیران ہونے کی وجہ سے اور کوئی غصہ کرنے یا رونے کی وجہ سے بندر بن جاتا ہے۔

کہانی ٹکڑوں میں بیان ہوئی ہے۔ کہیں مذہبی واقعات بیان ہونے لگتے ہیں اور کہیں تاریخی واقعات کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ابتدا میں بندروں کی کہانی سے واقعہ سبت کو بیان کیا گیا۔ اسی طرح ایک جگہ فرعونِ مصر کے ذریعے کہانی کے بیانیے کو آگے بڑھایا گیا ہے بعد ازاں عرب تہذیب سے بھی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یوں

لگتا ہے کہ واقعات کا ایک کولاژ بنا ہوا ہے۔ادب میں اس تکنیک کو Fragmentation کہتے ہیں۔اسی طرح افسانے کی کہانی کسی واضح نتیجے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا اختتام کھلا ہے۔۔ایسا اختتام دراصل خود انسانی حالت کی غیر یقینیت کو پیش کرتا ہے۔ بیانیے کی اس بے ترتیبی اور ٹکڑوں میں بیان ہونے کی وجہ سے کہانی کا مرکزی خیال التوا کا شکار ہے۔

افسانے میں الیاسف کے علاوہ جن کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ الیعذر، الیعذر کی لونڈی، اس کی جورو، الیاب، ابن زبلون، بنت الاخضر اور فرعون شامل ہیں۔ یہ سب مذہبی تاریخی کردار ہیں۔الیعذر ایک پادری تھا جو اپنے والد ہارون کی وفات کے بعد جانشین بنا۔ وہ حضرت موسیٰ کا بھتیجا تھا۔الیاب حضرت داؤدؑ کے سب سے بڑے بھائی کا نام تھا۔ابن زبلون حضرت یعقوبؑ کے بیٹے کا نام تھا۔افسانے میں کرداروں کے نام عہد نامہ عتیق سے مستعار لیے گئے ہیں۔

افسانے میں پسِ متن ترقی پسند تحریک پر طنز کیا گیا ہے۔چونکہ یہ تحریک حقیقت پسندی کے نقطہ نظر کی حامل رہی ہے، اس لیے افسانے میں اس سے مخالف رویے کا اظہار ملتا ہے۔اس تحریک نے زبان وادب کے ذریعے نئے ذہن اور نئے مزاج کو متعارف کرایا۔اس تحریک نے زبان اور ادب کو مخصوص طبقے کی اجارہ داری سے آزاد کرا کر تمام لوگوں کا آئینہ بنایا۔ یہ سوچ چونکہ ماضی سے انحراف کی صورت میں سامنے آتی ہے اس لیے انتظار حسین کے ہاں اس کی قبولیت نہیں ہے:

> ”الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی۔ کہ وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے وہ اس لفظ سے محروم ہو گئے۔افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال بن کر رہ گیا۔ اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔ آج لفظ مر گیا۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔“3

افسانے میں رومانوی فکر سے بھی اجتناب کی بات کی گئی ہے۔اسی لیے متن جذبات کے اظہار سے ممانعت کے نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔کوئی ہنسنے کی وجہ سے بندر بن رہا ہے اور کوئی محبت، نفرت، ہمدردی اور غصہ کرنے کی وجہ سے اپنی جون بدل رہا ہے۔یعنی جذبات کے اظہار کرنے کو طنز کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اور اس سے بچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ بندر بن رہے ہیں۔ رجعت پسندانہ فکر کی وجہ سے متن میں جدیدیت کے تمام رجحانات سے انحراف کا رویہ ملتا ہے۔بندروں کے ذکر سے ڈارون کی تھیوری کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ڈارون نے بندروں کو انسانوں کی قریب ترین نسل کہا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ انسانوں اور بندروں کے جدامجد ایک ہی تھے۔بعدازاں دونوں نے اپنی نسل کی بقا کے لیے جو ارتقائی سفر طے کیا اس سے ان کی طبعی ساخت میں تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔یہاں بندروں سے مراد وہ نیا انگریزی کلچر ہے جس کی طرف تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ مائل ہو رہے تھے۔بندروں کی علامت نو آبادیاتی نظام کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ بندر "انگریز" کا استعارہ رہا ہے۔وہ بظاہر تو چلے گئے لیکن اُن کے جانے کے بعد بھی اُس تہذیب کو اپنانے کا رویہ مقامی لوگوں میں عام ہے۔

مکانی حوالوں سے دیکھا جائے تو سمندر کے کنارے آباد بستی کا تذکرہ ہے۔اس سے مراد کراچی شہر ہے۔ متن میں اس شہر کے لیے "قریہ "اور "بستی "دونوں نام استعمال ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ "سمندر کے کنارے" "اونچے برجوں "اور "بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی" کے مکانی حوالے بھی ملتے ہیں۔یہ ڈبائی شہر کا نقشہ ہے جس کو انتظار حسین کے اکثر افسانوں میں بیان کیا گیا ہے۔

کہانی کے اندر وقت خط مستقیم میں نہیں چلتا بلکہ انتظار حسین نے وقت کی خطی ساخت کو درہم برہم کر دیا ہے۔انہوں نے کہانی میں وقت کو ایک جال کی طرح بُنا ہے۔اس جال کو وہ علامتوں اور استعاروں کے ذریعے جوڑتے رہتے ہیں۔ مختلف تہذیبیں آئیں اور ختم ہو گئیں۔افسانے میں اس تہذیبی شکست وریخت کو وقت کے الٹ پھیر کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ابن خلدون نے بھی یہی کہا تھا کہ "ماضی مستقبل سے اس طرح مشابہہ ہے جیسے پانی کا ایک قطرہ دوسرے قطرے سے۔ "4 متن بنیادی وجودی اور فلسفیانہ سولات کو بھی قائم کرتا ہے۔پہلا سوال شناخت کا ہے جس کو برقرار رکھنے کے لیے الیاسف طویل جنگ لڑتا ہے۔یہ دراصل ماضی کی تہذیب کی طرف مراجعت اور اُس کی اقدار کو زندہ رکھنے کی خواہش کا اظہار ہے۔پرانی تہذیب مٹ رہی ہے اور نئی تہذیب کی کوئی شناخت نہیں ہے۔اس لیے اپنے اسی تہذیبی ورثے کو بچانے کے لیے وہ تگ ودو کر رہا ہے۔ لیکن اکیلا فرد کب تک اس کو بچا کر رکھ سکتا ہے۔آخر کار وہ بھی اس نئی شناخت کو اختیار کر لیتا ہے۔افسانے میں انسانی تنہائی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔الیاسف جب شناخت کے لیے کوشش کر رہا ہوتا ہے تو وہ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔چونکہ آدمی کو شناخت کے لیے ایک اور آدمی کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ بنت الاخضر کو یاد کرتا ہے۔

شناخت کے بحران اور انسانی تنہائی کے ساتھ فلسفۂ دکھ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔بدھا کا فلسفۂ زندگی ہی یہ ہے کہ سب کچھ دکھ ہے۔افسانے کے مختلف کردار دوسری جون میں بدلتے جا رہے ہیں۔وہ خوشی سے نہیں جا رہے دکھ سے جا رہے ہیں۔فلسفۂ جبر وقدر کے تناظر میں بھی دیکھا جائے تو اس افسانے کے کردار اپنی جون بدلنے پر مجبور اور بے بس نظر آتے ہیں۔الیاسف کا جہاں تک بس چلتا ہے وہ اپنے سب جذبات کی قربانی دیتا ہے۔تاہم ایک حد تک وہ ضبط کر سکا اس کے بعد وہ بھی جون بدلنے پر مجبور ہو گیا۔

وجودی فلسفے کا بنیادی سوال ہی یہ ہے کہ میں کون ہوں؟ افسانے میں الیاسف بھی اسی سوال کو بار بار دہراتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اور کن میں سے ہے۔خود کو دوسروں سے مختلف سمجھتا ہے اس لیے بار بار کہتا ہے کہ جو جن میں سے ہے اُن کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ لیکن اسے اس بات کا ادراک بھی ہے کہ وہ بھی انہی میں سے ہے۔یہ اس کی اپنے وجود کے لیے ماورائی تلاش ہے۔ صوفیانہ ادب میں انسان کی اس وجودی تلاش کو ہر جگہ موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔فریدالدین عطار نے منطق الطیر میں اسی وجودی تلاش کو بیان کیا ہے۔ تیس پرندوں کا غول راہِ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد جب سیمرغ تک پہنچا تو انھیں علم ہوا کہ ان میں اور سیمرغ میں کوئی فرق نہیں ہے۔اپنی ذات کی تلاش کے اس سفر کو میر تقی میر کی شاعری میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

"پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تیئں　　　معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا"5

متن میں فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشھود کو بھی بیان گیا ہے۔وحدت الشھود میں شواہد سے چیزوں کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔الیاسف جب شواہد کے توسط سے دیکھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ لیکن جب وہ وحدت الوجود کی طرف جاتا ہے تو اسے سمجھ ہی نہیں آتی کہ وہ کن میں سے ہے۔یہ چیز

اس میں داخلی کشمکش پیدا کرتی ہے۔خوشی اور غم ،راہِ سلوک کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔غصے میں انسان دنیاوی چیزوں سے ماورا ہو جاتا ہے۔وہ جو چیزیں چھوڑتا ہے ان سے وجودی سطح پر چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔

بظاہر افسانے کا وجودی یا فلسفیانہ تناظر غالب نظر آتا ہے۔الیاسف اپنے وجود کی اسی کشمکش کا شکار نظر آتا ہے لیکن اس کو معنی نہیں ملتے۔چنانچہ وہ اسی اضطراب کا شکار رہ جاتا ہے۔کیونکہ دنیاوی تصورات اتنے زیادہ تضادات کا شکار ہیں کہ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔بحیثیت لکھاری وہ خود کو الیاسف سمجھتے ہیں یعنی الیاسف کے فریم میں خود اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔

بین المتنیت اور ثقافتی حوالہ جات کی افسانے میں کثرت ہے۔بین المتونیت کے بیشتر حوالے مذہبی اور تاریخی واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔یعنی وہ تاریخی واقعات جو مذہبی متون میں ملتے ہیں۔اس کے ساتھ ادبی حوالہ جات بھی ہیں۔تاریخی واقعات کو مصنف نے علامتوں اور استعاروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔اسی طرح مذہبی متون کی پیش کش بھی صرف مذہبی واقعات تک ہی محدود نہیں رکھی گئی بلکہ انھیں افسانوی متون کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا ہے۔اسی وجہ سے بیانیہ پیچیدہ ہو گیا ہے اور قاری کو لگتا ہے کہ تاریخی واقعے کو بیان کیا جا رہا ہے۔لیکن گہرائی اور گیرائی سے دیکھا جائے تو متن افسانوی ہی ہے۔معبود کی قسم کھائی سے مراد مذہبی حوالہ ہے۔یعنی اس بستی کے لوگ کسی مذہب کے پیروکار ہیں۔دیگر مذہبی حوالوں میں حُر کے امام حسین کے ساتھ تاریخی مکالمے کا تذکرہ ملتا ہے۔تمہاری ماں تمہارے غم میں بیٹھے۔یہ اس تاریخی مذہبی واقعے کی طرف اشارہ ہے جب حُر نے امام حسینؑ کا راستہ روک لیا تھا۔امام حسین کی فوج نے حُر کے لشکر بشمول گھوڑوں کی پیاس بجھائی تھی۔بعد ازاں جب امام حسینؑ نے آگے چلنے کا ارادہ کیا تو اس نے لگام پکڑ کر روکا تھا۔امام نے عربوں کی روایت کے مطابق اس سے کہا کہ "اے حر تمھاری ماں تمھارے غم میں بیٹھے"6۔اس موقع پر حُر نے امام حسین کی حرمت کا خیال کرتے ہوئے انھیں جواب نہیں دیا تھا۔بعد ازاں حُر اپنے بیٹے سمیت اسلامی لشکر میں شامل ہو گیا اور اس نے خود کو حق کے لیے قربان کر دیا۔

متن میں یونانی اسطورہ کے نرگسیت پر مبنی ایک حوالے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔یہ حوالہ یونانی اساطیر میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔نارسیس نامی شہزادے کو ایکو نامی پری نے بددعا تھی۔کہ "خدا کرے تم اپنی ذات کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ لیکن اسے کبھی حاصل نہ کر سکو۔بعد ازاں نارسس ایک دن پانی میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اپنی محبت میں دیوانہ ہو گیا۔بار بار خود کو پانی میں دیکھتا اور اپنا بوسہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔پھر یوں ہوا کہ نارسیس اپنے عکس کو پانے کی کھوج میں وہیں بیٹھا رہ گیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ایکو بے قراری میں اس کی جانب لپکی لیکن وہاں نارسیس کی جگہ نرگس کا پھول کھلا ہوا تھا۔

متن میں متعدد اضدادی جوڑے سامنے آتے ہیں۔پہلا جوڑا تہذیب اور بربریت کا ہے۔بنت الاخضر پرانی تہذیب کی نمائندہ ہے جبکہ انسانوں کا جانوروں کی جون میں بدل جانا اُس بربریت کا اظہار ہے جس کا شکار انسان ہو رہے ہیں۔افسانے کا تھیم بھی یہی ہے کہ انسان اپنے مقام سے گر جائے تو اس کی جون بدل جائے گی۔متن ہمیں بتاتا ہے کہ الیاسف اس بستی کے لوگوں میں سے نہیں ہے وہ خود کہتا ہے "تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں ہوں"7۔تاہم متن کے اپنے ہی بیان میں تضاد ہے کیونکہ وہ ان میں سے ہی ہے۔اسی لیے انسانی جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بھی بندر بن جاتا ہے۔

دوسری بائنری ماضی اور حال کی ہے۔ کہانی بظاہر حال میں چلتی ہے تاہم راوی کے اپنے بیانیے اور الیاسف کے شعور کی رو کہانی کو بار بار ماضی میں لے جاتی ہے۔ یوں کہانی ماضی اور حال کے درمیان شفٹ ہوتی رہتی ہے۔

تیسرا اضدادی جوڑا بقا اور فنا کا ہے۔ کسی بھی جاندار کے اندر یہ خواہش جبلی طور پر موجود ہوتی ہے کہ وہ باقی رہے۔ الیاسف کی بھی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنی جون میں رہے لیکن وہ اپنی جون کو بچا نہیں سکا۔ فنا کی طاقت انسان کو ہر لحہ شکست وریخت کا شکار رکھتی ہے بالآخر وہ اس کے آگے ہار مان جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں فنا کے اس فلسفے کو بہت سے شعرا اور فلسفیوں نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال کی نظم "حقیقتِ حسن" میں اس فلسفے کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

"خدا سے حسن نے ایک روز یہ سوال کیا جہاں میں کیوں نہ تو نے مجھے لازوال کیا

ہوئی ہے رنگ تغیّر سے جب نمود اس کی وُہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی"8

یہ سب چیزیں مرکزی کردار الیاسف کے ذریعے بیان ہوئی ہیں۔ وہ ایسے قریے میں سفر کر رہا ہے جو ان تضادات کا شکار ہے۔ یہ تضادات واضح نہیں بلکہ مبہم ہیں۔ کہانی حال میں چل رہی ہے اور پھر حال ماضی میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح متن بتاتا ہے کہ سب کی جون بدل رہی ہے لیکن الیاسف کی جون نہیں بدلتی حالانکہ وہ بھی انہی انسانی خصلتوں کا شکار ہے۔ آخر میں وہ بھی اپنی جون کو بچا نہیں سکتا۔ اسی طرح بربریت کے دور میں بھی ایک شخص ایسا ہے جو انھیں برائی سے روک رہا ہے اس لیے وہ آخر تک آدمی ہی کی جون میں رہتا ہے۔

افسانوی متن کی یہ خوبی سمجھی جاتی ہے کہ وہ سادہ اور روزمرہ کے قریب ہو۔ اس افسانے کا متن علامتی ہے۔ تاہم ادب میں علامتوں کا استعمال بھی بہت احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ بعض علامتیں متعین ہوتی ہیں، ان سے وہی معنی مراد لیے جاتے ہیں جو کہ مرادی ہوتے ہیں۔ جبکہ بعض علامتیں بہت مبہم ہوتی ہیں ان کے ایک معنی نہیں ہوتے۔ مصنف کے ذہن میں تو اس کا ایک ہی معنی ہو سکتا ہے لیکن قاری تناظر میں ایسے متن کی کئی تشریحات ہوتی ہیں۔ معنوی لحاظ سے ایسا متن لا مرکزیت کا شکار ہوتا ہے اور کہانی کے مرکزی خیال کو مرکز گریزی کی طرف لے جاتا ہے۔ "بنت الاخضر" کی علامت ماضی کے معنوں میں بھی استعمال ہوئی ہے اور خوشحالی، امن کی علامت بھی ہے۔ اسی طرح الیاسف انسان کی نفسانی خواہشات کی علامت ہے۔

انتظار حسین کے اسلوب کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اضافتوں کے استعمال سے واقعات کی شدت کو بڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً بڑے خوف، بڑی آواز، اونچے برجوں اور بڑے دروازوں وغیرہ۔ اسی طرح واقعات اور جملوں میں تکرار سے بھی واقعہ نگاری کے تاثر کو ابھارتے ہیں۔ بنت الاخضر کا ذکر افسانے میں بار بار ہوا ہے، اسی طرح الیعذر کے بندر بننے کا واقعہ بھی ایک سے زیادہ بار دہرایا گیا ہے۔ اسی طرح ہرن کے تڑپتے ہوئے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے، محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی کا ذکر بھی تکرار سے آیا ہے۔

متن میں موسم کے "بھاری مہینے "کا استعارہ استعمال ہوا ہے۔اس کے معنی فسادات کا زمانہ ہے۔یہ وہ موسم ہے جس نے لوگوں میں اچھے اور بُرے کی تمیز ختم کر دی تھی۔اس کی وجہ سے ثقافتی اور سماجی سطح پر جو انتشار اور بے ترتیبی پیدا ہوئی اُس نے اس نسل کے لوگوں کو اضطراب کا شکار کر دیا تھا۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس عہد کو فسادات کے زمانے سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ایک ایسا تہذیبی سانحہ ہے جس نے داخلی اور خارجی سطح پر ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

متن میں کئی ابہام موجود ہیں۔کہانی سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ تین دن پہلے بندر کیوں غائب ہو گئے ؟اگر تو بستی والوں نے اُن کے نقصان سے بچنے کے لیے کوئی حکمت عملی اختیار کی تھی تب بھی متن میں اس بات کی وضاحت ضروری تھی۔لیکن اُن کا اس طرح سے اچانک غائب ہو جانا کہانی میں ابہام پیدا کرتا ہے۔اسی طرح الیاسف کو آغاز میں عقل مند بتایا گیا ہے،لیکن متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی بستی کے باقی لوگوں جیسا ہے۔اُن کی طرح وہ بھی غصہ کرتا ہے،حیران ہوتا ہے اور ہر طرح کی صورت حال کے مطابق جذبات کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر افسانہ ’’آخری آدمی‘‘تاریخی،ثقافتی،اور مذہبی حوالوں سے بھرپور متن ہے۔مزید برآں دوطرفہ تضادات،زبان کے عدم استحکام،وقت کی ساخت کا درہم برہم ہونا،بین المتنی عناصر،میٹافکشنل عناصر کا جائزہ لینے سے کہانی میں موجود پیش متن،بین المتن اور پسِ متن پیچیدہ معانوی ساخت تک پہنچا جا سکتا ہے۔متنی بیانیے سے واقفیت قاری کو مروجہ تصورات پر سوالات اٹھانے،تشریحات کے ابہام اور معنوی کثرت کو تسلیم کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔افسانہ ’’آخری آدمی‘‘انسانی وجود میں موجود غیر یقینیوں اور تضادات کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ ادبی،سماجی اور تہذیبی حالتوں کو تنقید اور طنز کا نشانہ بھی بناتا ہے۔

حوالہ جات

1۔اعجاز راہی۔اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ(راولپنڈی:ریز پبلی کیشنز،2003ء)ص163

2۔گوپی چند نارنگ۔اردو افسانہ روایت اور مسائل(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2011ء)ص531

3۔انتظار حسین۔آخری آدمی(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،1993ء)ص24-25

4۔عبدالرحمن دہلوی(مترجم)۔مقدمہ تاریخ ابن خلدون،از ابن خلدون(لاہور:الفیصل،1993ء)ص23

5۔عبدالحق(مرتب)۔انتخاب کلام میر،از میر تقی میر(نئی دہلی:انجمن ترقی اردو،1989ء)ص41

6۔مجتبیٰ حسن۔مقتل الحسین(لکھنؤ:سرفراز قومی پریس،س ن)ص30

7۔انتظار حسین۔آخری آدمی(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،1993ء)ص23

8۔محمد اقبال۔کلیات اقبال(نئی دہلی:مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،1997ء)ص94

References:

1. Ejaz Rahi.Urdu Afsanay Mein Asloob ka Aahang. Rawalpindi: Rays Publications, 2003. P 163.
2. Gopi Chand Narang. Urdu Afsana: Riwayat aur Masail. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2011. P 531.
3. Intizar Hussain. Aakhri Aadmi. Dehli: Educational Publishing House, 1993. P 24–25.
4. Abdur Rehman Dehlavi. (Mutarjim). Muqaddima Tareekh Ibn Khaldun, az Ibn Khaldun. Lahore: Al-Faisal, 1993. P 23.
5. Abdul Haq (Murattib). Intikhab-e-Kalam-e-Mir, az Mir Taqi Mir. Nai Dehli: Anjuman Taraqqi Urdu, 1989. P 41.
6. Mujtaba Hasan. Maqtal-e-Hussain. Lucknow: Sarfaraz Qaumi Press, s.n. P 30.
7. Intizar Hussain. Aakhri Aadmi. Dehli: Educational Publishing House, 1993. P 23.
8. Muhammad Iqbal. Kulliyat-e-Iqbal. Nai Dehli: Markazi Maktaba Islami Publishers, 1997. P 94